CALL No. ______ ACC. NO. ______

AUTHOR ______

TITLE ______

30 DEC 2005

THE BOOK MUST BE CHECKED AT THE TIME OF ISSUE

اللہ

[illegible]

14

بیکراں

بیکراں

جگن ناتھ آزاد

مکتبۂ قصرِ اردو
اردو بازار، دہلی

طبع اول ۱۰۰۰
قیمت اڑھائی روپے

پبلشر۔ مکتبۂ قصرِ اُردو ۔ دہلی
پرنٹر۔ پیرامونٹ پریس دریا گنج دہلی

ترتیب

پیش لفظ

سچے معنوں میں بحیثیت شاعر مشہور ہونا ہر دور میں ایک مشکل امر رہا ہے۔ فصیح اور بے عیب کہنے والوں کی اکثریت بھی مشہور نہیں ہو سکی۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ شروع میں تو نام اُچھلا اور نگاہیں اُٹھیں لیکن شہرت دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ ڈاکٹر جانسن کا قول ہے کہ کامیابی ایک عام بدنصیبی ہے۔ لیکن کم عمری میں کامیابی نصیب ہونا سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔

بہر حال شاعری میں ایسی کامیابی جو ثابت قدم بھی ہو اور ترقی پذیر بھی کم یاب ہے۔ پھر جب ہم دورِ حاضر کی بلند پایہ اردو شاعری کے نمونوں اور مطالبوں پر نظر ڈالتے ہیں تو کسی شاعر کا اپنے لئے خاص جگہ پیدا کر لینا ہر لحاظ سے قابل توجہ کارنامہ ماننا پڑتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے دورِ حاضر کی اردو شاعری میں اپنے لئے ایک خاص جگہ پیدا کر لی ہے۔ اس کا ہر صاحبِ ذوق کو بخوشی اور بے تکلف اعتراف ہو گا۔

فرانس کے سب سے بڑے نقاد سین بیو نے کہا ہے کہ

جب میں کوئی کتاب پڑھتا ہوں تو پہلے اس کتاب کے ادبی و فنی و فکری محاسن پر نظر نہیں ڈالتا بلکہ یہ دیکھتا ہوں کہ اس کتاب کا مصنف کتنا اچھا آدمی ہے۔ نیکی و شرافت جو زندگی کے سب سے بڑے جوہر ہیں ادب و شاعری کے بھی سب سے قیمتی جوہر و عناصر ہیں۔ حقیقی ادبی تخلیق حقیقت میں ایک اخلاقی

مل ہے۔ آزاد کی شاعری میں جو صفت سب سے زیادہ جاذب
ظر اور سب سے زیادہ دلکش ہے وہ آزاد کی وہ نیکی اور انسانیت
ہے جس میں تصنع کا نام نہیں۔ زندگی کا یہ خلوص ہی آزاد کی شاعری
محرک اور اخلاق ہے۔ آزاد کے خیالات اور ان کے لہجے
میں سچی انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اور این
سعادت بزورِ بازو نیست۔

آزاد بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ان کے والد تلوک چند محروم
جتنے اچھے اور پختہ کار شاعر ہیں اتنے ہی اچھے اور قابلِ احترام انسان
بھی ہیں۔ آزاد نے بلند سے بلند جو مغربی و مشرقی تعلیم و تہذیب اس
زمانے میں حاصل کی جا سکتی ہے اُسے کامل طور پر حاصل کیا ہے۔ لیکن
ان کی تربیت میں غالباً کیا یقیناً جس چیز نے سب سے بڑا حصہ
لیا ہے وہ حضرت محروم کی "نظر" نے اور ان کے سنجیدہ کردار کی
خاموش فضا اور ماحول نے۔ ایسے غیر شعوری اثرات زندگی کو

سنوار دیتے ہیں۔ آزاد بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں لیکن ان کی بلند تعلیم

اس مرکزی اثر کے سانچے میں ڈھلی ہے جس کا ذکر میں نے کیا ہے ایسے

جوانِ صالح اس دور کے لئے اور ہر دور کے لئے مایۂ ناز ہیں سمجھ میں

نہیں آتا کہ آزاد کی انسانیت پر رشک کیا جائے یا قابلیت پر یا ان کی

اس شاعری پر جو نہ جانے کیوں رہ رہ کر دلوں کو کھینچتی ہے۔

آزاد کی غزلیات، رباعیات، قطعات اور نظمیات کو خواہ سرسری

طور پر کوئی پڑھے خواہ غائر طور پر یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ آزاد کی

آواز بیک وقت نرم متوازن اور مردانہ وار ہے۔ لہجہ بیک وقت

سنجیدہ و حساس ہے۔ خیالات جذبات قلب و نظر اس تربیت و

تہذیب کا پتہ دیتے ہیں جس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔ الفاظ

و بیان میں قابلِ رشک شستگی ہے۔ ان کے ہر شعر کے آئینے

میں ان کا کردار جھلک رہا ہے اور ان کے بہ جلِ دل و دماغ بھی

سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ ان کا کلام برابر ترقی کرتا ہوا

نظر آتا ہے۔ سطحیت تو ان کے کلام میں کہیں ہے ہی نہیں۔ ایک بڑھتی ہوئی گہرائی جس میں برابر تہیں پڑتی جا رہی ہیں ایک بلندی جو نئی منزلیں تلاش کر لیتی ہے۔ ایک ایسی تنقیدِ حیات جو سادہ و پُرکار ہے ایک ایسا اندازِ بیان جو چونکہ بے تصنّع ہے اس لئے بیحد دلکش ہے زندگی سے انسانیت سے، کائنات سے فطری اور پُر خلوص لگاؤ۔ ایک چوٹ کھایا ہوا دل جس نے اپنی چوٹ کو قبول کر لیا ہے یہ ہیں وہ خصوصیات جو آزاد کی شاعری کو امتیازی رنگ عطا کرتی ہیں۔

تقسیم ہندستان نے حضرت محروم سے ضعیفی میں اور آزاد سے جوانی میں ان کا محبوب خطّۂ وطن مغربی پنجاب چھڑوا دیا۔ اس سانحے نے آزاد کی شاعری میں ایک نئی کسک اور نیا چٹیلا پن پیدا کر دیا ہے۔ چھوٹے ہوئے وطن کی محبت نے ان کی معصوم و پُرخلوص ہنسی میں آنسوؤں کی چاشنی اور ان کے آنسوؤں میں تبسم کی جھلک پیدا کر دی ہے۔ اس سے ان کا کلام اور بھی چمک اُٹھا

ہے۔ دلّی اُجڑنے کے بعد جو شعراء دلی، لکھنؤ آ بسے تھے یا لکھنؤ
اُجڑنے کے بعد جن شاعروں کو رامپور و حیدر آباد کا منہ دیکھنا پڑا
ان کے کلام میں اپنی جنم بھوم کے لئے اتنے چٹیلے اشعار نہیں
ملتے جتنے آزاد کے کلام میں پنجاب کی یاد سے پیدا ہوئے انھیں
ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ جس خلوص سے آزاد نے نئے
اور اجنبی ماحول کو اپنایا ہے وہ بھی قابلِ صد ہزار تحسین ہے۔
سوچا تو میں نے یہ تھا کہ کلام آزاد سے جستہ جستہ نمونے پیش
کر کے ہر ٹکڑے پر کسی قدر تفصیل سے اظہارِ خیال کروں اور اس
طرح اپنے ذوقِ سخن پر احسان کروں لیکن اتنی فرصت نہیں نکال
پھر بھی آزاد کے مجموعۂ کلام کے ساتھ یہ پیش لفظ چھپ رہا ہے
اس لئے شائقین اس مختصر عبارت کو پڑھ کر جب اس مجموعے
کے اوراق پلٹیں گے تو آزاد کے کلام کی چمک دمک خود نگاہوں
کے سامنے آجائے گی۔ مشک آنست کہ . . . .

ایک آدھ بات اور کہہ لینے

دیجئے۔ آزاد کے تخیل اور فن اور ان کی ذہنی نشو ونمو کو سیراب و شاداب کرنے والے ایک طرف بلند ترین مغربی ادب اور علوم ہیں اور دوسری طرف رچے ہوئے فارسی ادب اور اردو ادب کے کارنامے ہیں۔ علم وادب کی دنیا کے وہ بہت بڑے سرمایہ دار ہیں۔ ان کی ہونہار اور سلامت رو شاعری کے لئے ابھی بہت بڑے امکانات ہیں۔ ان کی شاعری کا مستقبل تابناک ہے اور یہ مجموعہ مہر نیم روز کے طلوع کا پتہ دیتا ہے۔ ہمیں آزاد کی شاعری سے ابھی بہت اُمیدیں ہیں۔ آزاد کی شاعری کی جڑیں گہری ہیں۔ اُٹھان نہایت شاندار ہے اور اس کی تکمیل اور بھی زیادہ شاندار ہوگی۔ یہ شاعری کتابی شاعری نہیں ہے بلکہ زندگی کی آواز ہے، ایک چوٹ کھائے ہوئے مگر سوچنے والے دل کی پکار ہے اور ایک ایسے شاعر کا کلام ہے جسے

شعر کہنا آتا ہے۔

الہ آباد
۱۱ر ستمبر ۱۹۴۹ء

فراق گورکھپوری

سحر در شاخسار بوستانی
چه خوش می‌گفت مرغ نغمه‌خوانی
برآور هر چه اندر سینه داری
سرودی، ناله‌ای، آهی، فغانی

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری

فضا میں ہر طرف کیوں دھجیاں آوارہ ہیں اُن کی
جنونِ سر فروشی تیرے افسانوں پہ کیا گزری

وصالِ شمع کی حسرت میں سب بیتاب پھرتے تھے
میں کیا جانوں حضورِ شمع پروانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والو یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

نشانِ برگِ گُل تک بھی نظر آتا نہیں ہم کو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا گلستانوں پہ کیا گزری

جہاں نورِ سحر کے بھی قدم جمنے نہ پاتے تھے
بتائے کون آخر ان شبستانوں پہ کیا گزری

وہ رنگ و نُور سے بھرپُور لبستانوں پہ کیا بیتی
شباب و شعر سے معمُور کاشانوں پہ کیا گزری

ابھی تو چشمِ عبرت وقت کی رفتار دیکھے گی
ابھی یہ کس طرح کہہ دیں ستم رانوں پہ کیا گزری

نہ پوچھ آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ
ہوا تھا کیا یہ اپنوں کو یہ بیگانوں پہ کیا گزری

غزل

اے دوست! تری یاد نے بخشا وہ سہارا
ہر تلخیٔ دوراں کو کیا ہم نے گوارا

جیتی ہوئی بازی کو پھر اک بار وہ ہارا
یوں دل نے لیا تیری نگاہوں کا سہارا

انکار کریں گے جو کنارے نے پکارا
ہے عشق کی توہین کنارے کا سہارا

ہم شوق میں منزل سے بھی آگے نکل آئے
معلوم نہیں رُوح کو یہ کس نے پُکارا

ہر منزلِ دُشوار کو آسان بنایا

کیا چیز ہے اے ذوقِ نظر تیرا سہارا

محتاج ہے اے عشق! فقط ایک نظر کا

تاروں کا نظارا ہے کہ پھولوں کا نظارا

کچھ جیت کا احساس ہے، کچھ ہار کا احساس

معلوم نہیں اصل میں جیتا ہوں کہ ہارا

اے عقل! خدا تیرے سفینے کا محافظ

یہ عشق کا دریا ہے نہیں جس کا کنارا

گلشن بھی ترے اور بہاریں بھی تری ہیں

آزاد کا حصّہ ہے فقط زخم نظارہ

پسِ پردہ

خیال تھا کہ صبحِ نو اُفق پہ جگمگائے گی
ہر اک بلند و پست پر نشاط بن کے چھائے گی
قریب و دُور تک ردائے نور پھیل جائے گی
فلک بھی مسکرائے گا زمیں بھی مسکرائے گی

کچھ اپنا رنگ اس طرح یہ صبحِ نو جمائے گی

خیال تھا کہ اک بہارِ نو چمن میں آئے گی
چمن میں زندگی کی ایک لہر دوڑ جائے گی
جمود سے حیاتِ گلستاں نجات پائے گی

خزاں کا دور جائے گا بہار رنگ لائے گی
زمیں گنگنائے گی حسین گل کھلائے گی

خیال تھا کہ ظلمتوں سے ہم رہائی پائیں گے
خیال تھا کہ اپنے گھر کو اپنا گھر بنائیں گے
خیال تھا کہ مل کے جشنِ دورِ نو منائیں گے
خیال تھا کہ زندگی نجات غم سے پائے گی
خوشی کے ایک بحر بیکراں میں ڈوب جائے گی

خبر نہ تھی کہ وہ سحر نظر کو جس کا شوق ہے
ہر ایک راہرو کو رہ گذر کو جس کا شوق ہے
ہمارے بحر و بر کو خشک و تر کو جس کا شوق ہے
جب آئے گی تو ظلمتوں کی سیل ساتھ لائے گی
قریب و دور پر مہیب رات بن کے چھائے گی

خبر نہ تھی بہار جس کی آرزو چمن کو ہے

بہار جس کی جستجو چمن کے بانکپن کو ہے
بہار جس کا انتظار سنبل و سمن کو ہے
جب آئے گی تو موجِ زہرناک ساتھ لائے گی
خزاں کی طرح آئے گی چمن میں پھیل جائے گی

غزل

ترتیبِ نشیمن کیا ہوگی آئینِ گلستاں کیا ہوگا
آغازِ بہاراں کچھ تو بتا انجام بہاراں کیا ہوگا

اندازۂ طوفاں ہوتا ہے طوفاں کے قریب آ جانے سے
ساحل پہ بسیرا کرنے سے اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

یہ گلشنِ نو ہے گلشنِ نو اے فکرِ کہن کے دیوانو!
بیمارِ تفکر آخر اس گلشن میں غزل خواں کیا ہوگا

اس دور میں بھی کام آئے گا صدیوں کا پرانا علم ہے
اے پیرِ دبستاں بول ذرا دستورِ دبستاں کیا ہوگا

جب مرغ خوش الحاں دام قفس انعام ہو خوش الحانی کا
پھر نغمہ سرا گلزار میں تو اے مرغ خوش لحاں کیا ہو گا
جس غم سے تسکیں ملتی ہو اُس غم کا مداوا کون کرے
جس درد میں لذّت پنہاں ہو اُس درد کا درماں کیا ہو گا
تہذیب کا پرچم لہرایا ہر شہر و چمن ویران ہوا
تعمیر کا ہے سامان جو یہی تخریب کا ساماں کیا ہو گا
ماحول کی گرد سے کچھ ایسا دھندلایا حال کا آئینہ
کچھ اس میں نظر آتا ہی نہیں مستقبلِ انساں کیا ہو گا
اے بھاگنے والے وقت ہے یہ ہاں صحن چمن سے بھاگ نکل
جب باغ قفس بن جائے گا اُس وقت گریزاں کیا ہو گا

نئی محفل

جس کا جنم تقسیم ہند کے بعد بہ یک وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ہوا۔

ہم اپنی انجمن کو بھول جائیں بھی تو کیا ہوگا
نئی محفل کو ہم اپنا بنائیں بھی تو کیا ہوگا

چمن بدلا چمن کا رنگ بدلا باغباں بدلے
یہاں اب ہم پرانے گیت گائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں ہر سنگ پارے کو گہر کی شان حاصل ہو
نوادر ہم وہاں جاکر لٹائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں چاروں طرف آندھیاں مذہب کی چلتی ہوں
وہاں ہم عقل کی مشعل جلائیں بھی تو کیا ہوگا

جہالت کے جہاں پتھر ہی پتھر راستے میں ہوں
وہاں ہم نُطق کا دریا بہائیں بھی تو کیا ہوگا

خرد دُشمن جہالت آفریں ماحول میں اے دل
ترانے ہم تمدن کے جو گائیں بھی تو کیا ہوگا

جنہیں ذوقِ نظر بخشا گیا تھا ہو چکے رخصت
ہم اب تارے فلک سے توڑ لائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں ذوقِ ادب کے نام سے دنیا بدکتی ہو
وہاں اب ہم ادب کے راگ گائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں انسان کو اونچے تخیّل سے عداوت ہو
وہاں ہم موج میں تانیں اُڑائیں بھی تو کیا ہوگا

دلوں کا غیض جب اپنے دست! ابھر ہر دل نمایاں ہو

گلے شکوے زباں پر ہم جو لائیں بھی تو کیا ہوگا

جنوں ہی کار فرما ہو جہاں اطرافِ عالم میں
وہاں ہم عقل کی محفل سجائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں ماحول پر نفرت ہی نفرت راج کرتی ہو
وہاں ہم پیار کی دنیا بسائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں ہمدردیوں کا نام تک باقی نہ ہو دل میں
وہاں ہم درد کی دولت لٹائیں بھی تو کیا ہوگا

تو گہری نیند میں ہے جاگنا آساں نہیں تیرا
ہم اے مرجھے ترے شانے ہلائیں بھی تو کیا ہوگا

تجلی کا اب اس ماحول میں طالب نہیں کوئی
اندھیری رات میں ہم جگمگائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں ماحول انساں پر سکوتِ مرگ طاری ہو
وہاں ہم حوصلوں کو آزمائیں بھی تو کیا ہوگا

جب اس محفل میں سُننے پر نہیں ہر کوئی آمادہ

تو پھر ہم نطق کا جادُو جگائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں آزاد! تا حدِ نظر بنجر زمینیں ہوں

گھٹائیں آن کر بارش لٹائیں بھی تو کیا ہوگا

دو شعر

ہاں حریفِ قہقہہ آہِ سرد ہی سہی

لب تو خندہ ریز ہیں دل میں درد ہی سہی

پاؤں تھک گئے تو کیا آرزو میں دم تو ہے

آنکھوں میں چمک تو ہے رُخ پہ گرد ہی سہی

غزل

اے دل اُلجھ گیا ہے مذاقِ نظر کہاں
منزل کہاں یہ حسنِ سرِ رہ گذر کہاں

اِک بار اگر قفس کی ہوا راس آگئی
اے خود فریب پھر ہوسِ بال و پر کہاں

گم ہو چکی ہے کاہکشاں گردِ راہ میں
اب دیکھیے ہو ختم ہمارا سفر کہاں

مانا چمن میں حکم زباں بندیوں کے ہیں
رازِ جنوں کو فاش کریں ہم مگر کہاں

گلشن میں خامشی ہے مرے اس سوال پر
ٹھہرے گا کاروانِ نسیمِ سحر کہاں
خارا شگافیوں کے زمانے گذر گئے
اب ڈھونڈتا ہے شوق کہیں شیشہ گر کہاں
آزاد چل کوئی نئی دنیا تلاش کر
جلوے یہاں بقدرِ مذاقِ نظر کہاں

جستجو

ہوس کو علم و فن کی آڑ میں چھپا رہا ہوں میں
سمجھ رہا ہوں یہ ترے قریب آ رہا ہوں میں
یہ جان کر کہ اپنے آپ کو بنا رہا ہوں میں
ابھی شعورِ خام کا فریب کھا رہا ہوں میں

خیال غرقِ آرزو نگاہ محوِ جستجو
پکارتی ہے زندگی کہاں ہے تو کہاں ہے تو
قریب و دور ظلمتیں ہی ظلمتیں ہیں چار سو
یہ اور بات ہے کہ آپ جگمگا رہا ہوں میں

عجب مقام ہے جہاں کوئی بھی رہنما نہیں
خرد کا آسرا نہیں جنوں کا آسرا نہیں
کہاں ہے منزلِ نظر مجھے کوئی پتہ نہیں
ابھی تو یہ خبر نہیں کہاں سے آ رہا ہوں میں

ادھر فلک کی نیلگوں فضا ادھر سحاب ہیں
ستارہ ہائے ضوفشاں ہیں مہر و ماہتاب ہیں
نگاہ پر ابھی تو رنگ رنگ کے حجاب ہیں
اگرچہ مدتوں سے یہ حجاب اٹھا رہا ہوں میں

غزل

فضا کو دیکھ کے ذوقِ نظر پہ کیا گذری
نہ پوچھئے ہوسِ اہلِ دید پہ کیا گذری

تمہیں کچھ اس کی خبر بھی ہے اے چمن والو
سحر کے بعد نسیمِ سحر پہ کیا گذری

یہ کاش تجھ کو بھی ذوقِ نظر بتا سکتا
تری تلاش میں ذوقِ نظر پہ کیا گذری

شکستہ شیشہ جو پھر شیشہ گر سے جڑ نہ سکا
خبر نہیں کہ دلِ شیشہ گر پہ کیا گذری

حضورِ دوست کا عالم بتا نہیں سکتا
میں کیا کہوں مرے قلب و نظر پہ کیا گذری

نظر تو محوِ غمِ جستجو تھی اے آزاد!
یہ اس کے ساتھ دلِ بے خبر پہ کیا گذری

طوفان کے بعد

رات کے پردے میں ہو جاتا ہے سامانِ سحر
رات کے پردے میں سامانِ سحر ہو نہ سکا
ختم گو ہو بھی چکا عالمِ ظلمات کا دور
صبح کا تارا نمودار مگر ہو نہ سکا

جا چکی رات اُفقِ مشرق پہ پو پھٹ نہ سکی
تیرہ و تار فضاؤں کی سیاہی نہ گئی
ایک افسانہ ہوا گرچہ خزاں کا عالم
صحنِ گلشن سے بگولوں کی تباہی نہ گئی

دیدۂ شوق نے یہ سمجھا کہ طوفان گئے

زندگی ایک سکوں پائے گی ہیجان کے بعد

لیکن اے آرزوئے دید! ذرا غور سے دیکھ

کتنے طوفان نمودار ہیں طوفان کے بعد

اپنے ماحول سے بیگانہ رہا جوشِ جنوں

عقل منزل کی طرف جا کے پلٹتی ہی رہی

سانس آزاد فضاؤں میں کبھی لے نہ سکی

زندگی موت کے دامن میں سمٹتی ہی رہی

حیف صد حیف کہ انسان کا یہ فکرِ منیر

تندِ طوفاں پہ ذرا سا بھی اثر کر نہ سکا

"وہ جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا

زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا"

ہم نے مانا کہ ہے طوفان کا مفہوم یہی
زندگی کی شب تاریک سحر ہو نہ سکے
اپنی منزل تو نظر آئے خرد کو لیکن
اپنی منزل کی طرف اُس کا گذر ہو نہ سکے

باوجود اس کے ارادوں کا تقاضا ہے یہی
لڑکھڑاتی ہوئی دنیا کو سنبھلنا ہے ضرور
تیز طوفان فضاؤں میں مچلتے ہی رہیں
مری بجھتی ہوئی قندیل کو جلنا ہے ضرور

غزل

اب ہیں سرگرمِ تلاشِ منزلِ جانانہ ہم
چھوڑ آئے ہیں حدودِ کعبہ و بتخانہ ہم

مستِ صہبائے نظر ہیں ساقیٔ مے خانہ ہم
ہیں ازل سے بے نیازِ شیشہ و پیمانہ ہم

چاند تارے اب تو گردِ راہ میں گم ہو گئے
کون سی منزل کے عازم ہیں دلِ دیوانہ ہم

یہ فقط آنسو نہیں اے چشمِ ظاہر بین دوست!
اپنی پلکوں پر لئے بیٹھے ہیں اک افسانہ ہم

ظلمتِ شب کی قسم پُر پیچ راہوں کی قسم
ساتھ دیں گے اب ترا اے ہمتِ مردانہ ہم

داستانِ عشق سے رنگیں ہے دل کی کائنات
عشق افسانہ ہے لیکن سُرخیِ افسانہ ہم

زندگی دشوار سے دشوار تر ہوتی گئی
چھیڑ بیٹھے یاالٰہی کون سا افسانہ ہم

بوالہوس اس خاک کا رتبہ ہمارے دل سے پوچھ
جانتے ہیں عظمتِ خاکسترِ پروانہ ہم

ہم سے اے آزاد حسن و عشق کی رمزیں نہ پوچھ
حسن سے ناآشنا ہیں عشق سے بیگانہ ہم

آج اے آزاد ہم محوِ غزل خوانی نہیں
بزم میں چھلکا رہے ہیں بلکہ اک پیمانہ ہم

شیلی

اس بزمِ جہاں کو کیا خبر تھی تیری
جو شام تھی دنیا کی سحر تھی تیری

جس پر نہ پہنچ سکا خیالِ انساں کا
اُس عالمِ بالا پہ نظر تھی تیری

طوفانِ حوادث سے نہ ڈرنے والے
ہنس کھیل کے دنیا سے گزرنے والے

اب کون سے گردوں کا ستارا ہے تو
اے بحرِ عمیق میں اُترنے والے

اے رفعتِ افلاک سے آنیوالے
عالم کو بس اک جھلک دکھانے والے

اب تک دلِ اہلِ دل میں تیرا ہی مقام
اے بحرِ فنا میں ڈوب جانے والے

غزل

پھر حسنِ خود نما پہ نظر کر رہا ہوں میں
پھر امتحانِ قلب و جگر کر رہا ہوں میں

پھر ہو رہا ہے درہم و برہم سکوتِ شب
نالوں سے چاک شب کا جگر کر رہا ہوں میں

دنیا میں مجھ کو جنسِ وفا کی ہے جستجو
خاشاک میں تلاشِ گہر کر رہا ہوں میں

اب دل کو ناپسند ہے پھولوں کا حسنِ رنگ
شاید بلند ذوقِ نظر کر رہا ہوں میں

پھر دل میں آ رہی ہے کسی بیوفا کی یاد
دنیائے دل کو زیر و زبر کر رہا ہوں میں

اب لطفِ صبح و شام گیا صبح شام سے
کچھ اس طرح حیات بسر کر رہا ہوں میں

تسکینِ جانِ زار! ترے انتظار میں
گو جانگزا ہے صبر مگر کر رہا ہوں میں

ایک منظر

سناور کی بلندیوں سے

شاید ہو تجھے تلخیٔ ایّام گوارا
دیکھ اے دلِ مشتاق! کسولی کا نظارا
وہ صبح کے دامن میں چھلکتے ہوئے انوار
وہ شام کے ماتھے پہ چمکتا ہوا تارا
کس حسن سے بدمست گھٹاؤں میں ہوا غرق
کہسار کی چوٹی کا فلک بوس کنارا

سرمست ہوا ہے کہ ہے چلتا ہوا جادو

بدمست گھٹا ہے کہ جنوں کو ہے اشارا

لوگوں سے جو سنتے ہیں کہ جنت بھی کوئی ہے

ممکن ہے کسی نے ہو یہی عکس اُتارا

پستی کو بلندی سے لڑھکتے ہوئے بادل

رفعت کو اُبھرتے ہوئے پانی کا نظارا

شاید تری رفتار سے ٹکرا کے گئی ہے

ملتا ہی نہیں ہے کوئی بدلی کو سہارا

یہ ابر یہ سبزہ یہ ہوائیں یہ گھٹائیں

کثرت نے دکھایا مجھے وحدت کا نظارا

یہ عالم پرکیف و سکوں ریز و جنوں خیز

جنت کا تصور بھی نہیں دل کو گوارا

غزل

مطمئن ہوں زیست سے زیست بار ہے تو کیا
زہر پی رہا ہوں میں ناگوار ہے تو کیا

عشق کے حضور میں سُرخرو تو ہو گئے
دامنِ حیات اگر تار تار ہے تو کیا

اپنی خلوتوں میں تو بے نیاز ہو گئے وہ
انتظار میں کوئی بے قرار ہے تو کیا

مقصدِ حیات بھی غم کے ساتھ ساتھ ہے
کارواں کے ساتھ ساتھ اک غبار ہے تو کیا

تو بھی ہے فنا پذیر میں بھی ہوں فنا پذیر
میں ہوں گر خزاں تو کیا تو بہار ہے تو کیا

رباعی

گیرم کہ وجودِ من سراپا خاک است
چیزے است دراں کہ غیرتِ افلاک است
مانندِ سرورے کہ نہاں شد بہ شراب
ہمرنگِ شرابے کہ نہاں در تاک است

سرِّ محبت

نہ بُود نقشِ دو عالم کہ رنگِ اُلفت بود
زمانہ طرحِ محبت نہ ایں زماں انداخت (جامیؔ)

اُس وقت بھی یہ راز فضاؤں پہ عیاں تھا
جس وقت نہ دنیا تھی نہ دنیا کا نشاں تھا
جس وقت ابھی کُن کا اشارہ نہ ہوا تھا
ظاہر کوئی دُنیا کا نظارہ نہ ہوا تھا
جس وقت نہ سورج تھا نہ مہتاب نہ تارے
پنہاں کسی پردے میں تھے تجلی کے شرارے

جس وقت نہ گرمی تھی نہ سردی تھی نہ برسات
ظاہر تھے یہ جب شام و سحر اور نہ دن رات
جس وقت نہ موجیں تھیں نہ موجوں کا تلاطم
نے ابرِ خروشندہ نہ باراں کا ترنم
خاموش تھا جب محفلِ فطرت کا ہر اک ساز
اُٹھتی تھی نہ جس وقت کسی سینہ سے آواز
جس وقت نہ بجلی تھی نہ بادل نہ بخارات
نے معدنیات اور نہ آثارِ نباتات
جس وقت نہ جنگل تھے نہ صحرا نہ بیاباں
نے رفعتِ کہسار تھی نے وسعتِ میداں
جس وقت نہ گھر کر کبھی آتی تھیں گھٹائیں
ہر وقت تھیں اک حال پہ خاموش فضائیں
جس وقت نہ تارے تھے نہ تاروں میں اشارے

معدوم تھے جب چاندنی راتوں کے نظارے
جس وقت نہ بلبل تھا نہ گل تھا نہ گلستاں

اک حال پہ رہنے سے فضائیں تھیں پریشاں
جس وقت نہ گونگا تھی نہ گنگا کی روانی

نے رودِ اباسیں کا مچلتا ہوا پانی
جب صفحۂ ہستی پہ مکیں تھا نہ مکاں تھا

ہنگامہ یہ سب غیب کے پردے میں نہاں تھا
جس وقت نہ دنیا تھی نہ دنیا کا نشاں تھا
اُس وقت بھی یہ راز فضاؤں پہ عیاں تھا

غزل

خرد تھی سر گشتہ و پریشاں اسے کہاں ضبط کا تھا یارا
مرے جنوں کا ہے یہ کرشمہ کہ تیرا غم کر لیا گوارا

دل و نظر کو کسی یادِ حسیں نے بخشا ہے وہ سہارا
کہ اب زمانے کا ہر ستم ہے دل و نظر کے لئے گوارا

یہ بات ہی اور ہے کہ ہم کو نہیں یہاں گفتگو کا یارا
دگرنہ یہ بازیٔ محبت نہ حسن جیتا نہ عشق ہارا

وہ دل عطا کر کہ جس کو ہوں پردہ ہائے گردوں بھی ناگوارا
نگاہ وہ دے کہ سنگِ خارا کو چیر کر دیکھ لے شرارا

یہ عالمِ رنگ و بو کو آزاد! کون سے ہاتھ نے سنوارا
جنوں کو حیرت ہے عقل گم ہے نظر کا دامن ہے پارہ پارہ

مرے سفینے مرے کنارے یمِ محبت کے تند دھارے
نہ اب سفینے کی آرزو ہے نہ اب نگاہوں میں ہے کنارہ

خبر نہیں بات کیا ہے جس سے چمن کے آنسو نکل پڑے ہیں
نہ جانے کیا کچھ بتا گیا ہے چمن کو یہ صبح کا ستارا

بھنور سے طوفاں سے خوف کیسا یمِ محبت میں آنیوالے
تری نظر ہی یقیں سے عاری وگرنہ ہر موج ہے کنارا

اگرچہ طوفانِ ابر و باراں فضاؤں پر ہے محیط لیکن
ثبات اپنا دکھا رہا ہے کہیں کہیں کوئی کوئی تارا

تری وفا کا تری محبت کا موجِ طوفاں اب امتحاں ہے
وہ اپنی رعنائیاں دکھا کر بلا رہا ہے مجھے کنارا

بہار لائے گی مشکلوں کا جب ایک طوفاں تو کیا کریں گے

نہ رنگ و بو تھا نہ زمزمے تھے خزاں میں تو ہو گیا گزارا

نہ حل ہوئیں مشکلیں نظر کی اگرچہ دنیائے رنگ و بو میں

کبھی خرد پر کیا بھروسہ کبھی جنوں کا لیا سہارا

کبھی حوادث سے جنگ کر کے کبھی حوادث میں رنگ بھر کے

جنھیں تھا سودا سنوارنے کا انھوں نے قسمت کو یوں سنوارا

نہ ہو تمناؤں میں جو خامی تو کیا ہے گردوں کی پردہ بندی

کہ عشق کی اک نظر جو چاہے تو چیر دے اندرونِ خارا

سنبھال کر ہم نے پھر بھی رکھا ہوا ہے آزاد غم کسی کا

اگرچہ زورِ جنوں کے ہاتھوں ہے دامنِ دل ہزار پارہ

آزادی کے بعد

گرد دامن سے غلامی کی چھڑانے والے
ترے ماتھے پہ غلامی کا نشاں آج بھی ہے
جو سماں تیری نگاہوں سے نہاں ہے شاید
وہ سماں میری نگاہوں پہ گراں آج بھی ہے
تو بہاروں کا فسوں دیکھ کے مسحور نہ ہو
تو بہاروں کے تعاقب میں خزاں آج بھی ہے

آج بھی روح میں ہے درد کی دنیا آباد
دمِ نجود کانپتے ہونٹوں پہ فغاں آج بھی ہے

آج بھی دل میں ہیں بے تاب تکلم نالے
اور سینے میں دلِ زارِ طپاں آج بھی ہے

جلوہ فرمائی پہ حسن آج بھی آمادہ نہیں
عشق کی ڈوبتی نظروں میں فغاں آج بھی ہے

آج بھی دیدۂ افکار پہ پردے ہیں محیط
حل طلب مسئلۂ سود و زیاں آج بھی ہے

عندلیب آج بھی گلزار میں ہے محوِ فغاں
درد ہر پھول کے سینے میں نہاں آج بھی ہے

یہ الگ بات ہے تو اس کو نہ دیکھے لیکن
ترے ماحول میں آہوں کا دھواں آج بھی ہے

رنگ محفل کا بدلتا نظر آتا ہی نہیں

ایک کا سود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے

آج بھی بندہ و آقا میں تفاوت ہے وہی

دیدۂ عدل بہر سو نگراں آج بھی ہے

آج بھی شور فضا میں ہے وہی محنت کا

گوشِ سرمایہ پہ یہ شور گراں آج بھی ہے

بزمِ احباب سے آتی ہے صدا اُٹھی ہوئی

شورِ ناقوس سے آوازِ اذاں آج بھی ہے

آج بھی مہتمِ نظر ہے وہی سینوں کا عناد

بند اخلاص و محبت کی دُکاں آج بھی ہے

آج بھی پائی نہیں دین سے دنیا نے نجات

نالہ کش محفلِ صاحب نظراں آج بھی ہے

اس نئے عصر میں انصاف کی اے خلیقِ لطیف

صاف کہہ کوئی ترا مرتبہ داں آج بھی ہے

کون اس دور میں احول کا ہو شکوہ طراز
نطق پر دشنۂ احکام رواں آج بھی ہے

تین شعر

سماج کے اے قدیم ڈھانچے حیات سے تازگی چرا کر
سنور رہا ہے تو کس لئے تو تجھے تو اب ٹوٹنا پڑے گا

پلانے والے خبر بھی ہے پستی و بلندی روا ہو جس میں
یہ پینے والوں کے ہیں ارادے وہ میکدہ لوٹنا پڑے گا

رہے گا بطنِ خرد میں کب تک حیات کے بتِ قرار لائے
یہ وقت لے کر پیام آیا کہ اب تجھے پھوٹنا پڑے گا

غزل

ہر سانس تھا اک دلکش و رنگین ترانہ
اے کاش کبھی لوٹ کے آ جائے وہ زمانہ

وہ صبح کے آثار نہ وہ لطفِ صبوحی
وہ شام کے انوار نہ وہ کیفِ شبانہ

اے سروِ سرافراختہ، ہاں پردہ شہناز
اے مطربِ نوخاستہ اک لحنِ حبیبانہ

عشرت کدۂ جادوئے بابل ہیں لبِ لعل
آنکھیں تری حیرت کدۂ سحرِ فسانہ

اے گردشِ ایّام! خبردار خبردار
آساں نہیں کچھ نقشِ تمنّا کا مٹانا

عشق اور خرد میں جو تفاوت ہے تو یہ ہے
عشق ایک حقیقت ہے خرد ایک فسانہ

پھولوں سے بہاروں سے ستاروں سے گذر جا
ہے دور کہیں ذوقِ نظر تیرا ٹھکانہ

کیا جانیئے آزاد! مرا عشقِ جنوں خیز
جینے کا سہارا ہے کہ مرنے کا بہانہ

دو آتشہ

ابو سعید ابو الخیر رح کی رباعیات

دن گزرا غمِ جہانِ فرسودہ میں
اور شب ہوسِ بودہ و نابودہ میں
القصّہ حیاتِ بیش قیمت ساری
گذری یوں ہی فکرہائے بیہودہ میں

وصل اُس کا کہاں اور یہ مہجور کہاں
دردانہ کہاں حوصلۂ مور کہاں

ہر چند کہ خوف مجھ کو جلنے سے نہیں
پروانہ کہاں اور آتشِ طُور کہاں

اشعار

اب کے تو رنگ و بو کا تماشا ہی اور ہے
یوں اپنا شوق سلسلہ جنباں نہ تھا کبھی
پھولوں کو دیکھتی ہیں نگاہیں کچھ اس طرح
جیسے میں آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی
وہ دن بھی تھے کہ شوق کی دنیا تھی اور ہم
شیرازۂ خیال پریشاں نہ تھا کبھی
انسانیت خود اپنی نگاہوں میں ہے ذلیل
اتنی بلندیوں پہ تو انساں نہ تھا کبھی

چاندنی اُتری پھلواڑی میں

باغ پہ کس نے جادو پھیرا　　پھولوں کو نیند آئی
ڈال ڈال پر پات پات پر　　مستی سی لہرائی

چاندنی اتری پھلواڑی میں
پھلواڑی مسکائی

پھول پھول پر کلی کلی پر　　بھونرا آکر گھومے
جانے اس کے من میں کیا ہے　　کلیوں کا منہ چومے

چاندنی اُتری پھلواڑی میں
پھلواڑی مسکائی

اپنی دھن میں گاتی مکھی رس لینے کو آئی
پھلواڑی کے نام نہ جانے کیا سندیسہ لائی

چاندنی اتری پھلواڑی میں
پھلواڑی مُسکائی

رات کی رانی دور کہیں سے اپنا راگ سنائے
گھولتی جائے کانوں میں رس من میں بیٹھتی جائے

چاندنی اُتری پھلواڑی میں
پھلواڑی مُسکائی

بھولے من! آخر یہ نظارہ کیوں تجھ کو تڑپائے
بھید کی باتیں پوچھنے والے! کون تجھے سمجھائے

چاندنی اُتری پھلواڑی میں
پھلواڑی مسکائی

غزل

شوق پابندِ فضائے چمنستاں نہ ہوا
دل بُرا جورِ خزاں سے بھی پشیماں نہ ہوا

صدمۂ ہجر سے دل جلوہ بداماں نہ ہوا
چوٹ کھا کر بھی یہ پتھر شرر افشاں نہ ہوا

آدمی ہو کے بھی دنیا میں وہ انساں نہ ہوا
ننگ و ناموسِ وطن کا جو نگہباں نہ ہوا

تری نظروں میں علاجِ غمِ دوراں ہے مگر
ان سے اپنا تو علاجِ غمِ دوراں نہ ہوا

فصلِ گل آئی بھی اور باغ سے رخصت بھی ہوئی

آہ وہ شوقِ فسردہ کہ غزل خواں نہ ہوا

نہ ہوئی برق چمک کر بھی تبسم کا جواب

پھول کھل کر بھی حریفِ رُخِ جاناں نہ ہوا

میں نے چاہا تھا بہاروں میں سما جاؤں مگر

یہ نظارہ بھی مرے شوق کے شایاں نہ ہوا

رُباعی

ہر شے کا ہے انداز بدلنے والا

ہر خار ہے گلشن سے نکلنے والا

مشرق کی طرف دیکھ کہ تاریکی میں

اک نور کا چشمہ ہے اُبلنے والا

کنارِ راوی

ایک کیفِ سرمدی سا عالم پہ چھا رہا تھا
دُنیا کا ذرّہ ذرّہ مستی میں آ رہا تھا
ہر چیز چاندنی سے زرپوش ہو رہی تھی
گردوں سے ماہِ تاباں سونا لٹا رہا تھا
دو موسموں میں باہم تھا اتّصال گویا
اک وقت آ رہا تھا اک وقت جا رہا تھا
راوی کے پل کے نیچے تھیں نغمہ بار لہریں
لہروں کا راگ دل کو بے خود بنا رہا تھا

موجوں سے ہلکے ہلکے گرداب پڑ رہے تھے

منظر یہ میرے دل میں طوفاں اُٹھا رہا تھا

اُس رات کی نہ پوچھو اُس رات کا نظارہ

احساس بن کے میرے دل میں سما رہا تھا

پل بھر میں دل کی لیکن حالت ہوئی دگرگوں

اس منظرِ حسیں سے دل دُور جا رہا تھا

اک انقلاب آیا ہر شے کی دل کشی میں

جو دلنشیں تھا منظر اب دل کو کھا رہا تھا

اب منظرِ حسیں پر جمتی نہ تھیں نگاہیں

کوئی دلِ حزیں کو پھر یاد آ رہا تھا

غزل

پھولوں کے متوالو کیا باغ سے پیار بڑھانا ہے
شاخ پہ دو دن رہنا ہے گانا ہے اُڑ جانا ہے

محفل میں آنے والے! پروانوں کا کھیل بھی دیکھ
دوست کی محفل میں آکر اب واپس کیا جانا ہے

راہِ سفر کی دشواری اور منزل سے بیزاری
یہ تو روز کی باتیں ہیں ان سے کیا گھبرانا ہے

عالمِ فانی میں اے دل! اُن کلیوں کا تبسم دیکھ جنھیں
صبح کو شاخ پہ کھلنا ہے شام کو مرجھا جانا ہے

یہ آباد سا ویرانہ یہ ویران سی آبادی
دل بھی عجب آبادی ہے دل بھی عجب ویرانہ ہے

اس میخانے میں اپنے شوقِ طلب کی بات نہ پوچھ
روزِ ازل سے شوقِ طلب اک نگوں پیمانہ ہے

رقص

احساس میں تو دمک رہی ہے گویا
پیمانے سے مے چھلک رہی ہے گویا
آنکھیں ہیں کہ ہر لحظہ جھپک جاتی ہیں
شبنم پہ کرن تھرک رہی ہے گویا

اُمید

تُند ہوئیں پُر کیف ہوائیں
گھر گھر چھائیں مست گھٹائیں
ہو گئیں ظلمت پوش فضائیں
بزم جہاں کو آناً فاناً
تاریکی نے گھیر لیا ہے

دیکھ وہ چمکا ایک ستارا
روشن روشن پیارا پیارا
روح کی تسکیں جس کا نظارا
مست گھٹاؤں سے بے پروا
ظلمت کے طوفاں میں کھڑا ہے

یہ تارا ان طوفانوں میں
کہساروں میں میدانوں میں
آبادی میں ویرانوں میں
عزم کی مشعل ہاتھ میں لے کر
اے دل! تیرا راہ نما ہے

غزل

اس معمورۂ فانی میں گلزار ہیں یا ویرانے ہیں
یہ بھی ترے کاشانے اے دل وہ بھی ترے کاشانے ہیں

غم کا انھیں احساس کہاں احساس سے یہ بیگانے ہیں
دیوانوں کی بات ہی کیا ہے دیوانے دیوانے ہیں

رات کے یہ تاریک مناظر صبح کی رنگین فضا
یہ بھی تری روداد ہے اے دل! وہ بھی ترے افسانے ہیں

تو اپنوں کو ڈھونڈ رہا ہے دنیا کے معمورے میں
یہ بیگانہ دیس ہے اے دل! اس میں سب بیگانے ہیں

رات جنھوں نے محفل کو انداز سکھائے جینے کے
خاکستر کو دیکھنے والے! ہاں یہ وہی پروانے ہیں

انسانوں کو ڈھونڈنے والے ذوقِ نظر! مایوس نہ ہو
یہ آبادی یہ معمورے اصل میں سب ویرانے ہیں

شعر و سخن میں ناممکن اظہار رہی جن افسانوں کا
پلکوں پر بیتاب سے قطرے خاموش افسانے ہیں

منزل سے بھی ناواقف ہیں راہ سے بھی آگاہ نہیں
اپنی دھن میں پھر بھی رواں ہیں یہ بھی عجب دیوانے ہیں

یہ تنہائی یہ ویرانہ شام کی یہ غمناک فضا
تم کو جو سو بار سنائے ہاں یہ وہی افسانے ہیں

خاک یہ دھندلے نقش فضا میں مٹتی آوازیں
ایک نظر آزاد! کہ یہ بھی چند جمیل افسانے ہیں

انڈیا گیٹ

انڈیا گیٹ کی رفعت ہے نگاہوں پہ محیط
انڈیا گیٹ وہ تاریخ کا اک بابِ جلیل
انڈیا گیٹ وہ افرنگ کی تعمیرِ جمیل
انڈیا گیٹ وہ اغیار کی نصرت کا نشاں
انڈیا گیٹ وہ اپنوں کی غلامی کی دلیل

کشورِ ہند کے جانباز محبانِ وطن
خون سے سینچنے نکلے ہیں پرائے ل کا چمن
ایک سیلاب شجاعت کا بڑھا آتا ہے

کہیں دجلے کی ہیں لہریں کہیں امواجِ جمن

واہ کیا جوشِ تہوّر کا ہے اشد غنی
ہر قدم سے ہے عیاں حسرتِ شمشیر زنی
بھوک ہر شخص کو جانباز بنا دیتی ہے
اور افلاس رہِ منزلِ حب الوطنی

دشت و کہسار پہ رکھتے ہیں کچھ اس طرح قدم
زیر و بم چال کا کھاتا ہے ارادوں کی قسم
ہند کی فوجِ ظفر موج جہاں جائے گی
گاڑ دے گی وہیں انگریز نصرت کا علم

سامنے دیدۂ مشتاق کے موجود ہر کیا

زندگانی کے خزانے سے یہ مفقود ہے کیا

اوجِ افلاک کو تو بال کشا ہے لیکن

مرے اخلاص تری منزلِ مقصود ہی کیا

انڈیا گیٹ کی رفعت ہے نگاہوں پہ محیط

اشعار

فقط حجاب ہیں نظر دل پہ اور کچھ بھی نہیں

یہ مہر و مہ یہ ستارے یہ آسماں یہ زمیں

یہ دوستوں کا رویہ یہ دشمنوں کا سلوک

جو مجھ سے پوچھ تو دونوں میں کوئی فرق نہیں

غزل یہ جس نے کہی ہے سلامِ شوق اُسے

"شرابِ لعل کش و روئے مہ جبیناں ہیں"

ہو جس میں بوئے وفا اور رنگِ صدق و صفا

ریاضِ دہر میں یارب! وہ پھول ہی کہ نہیں

غزل

امتحاں کی منزل تک تیرے شوق کے صدقے ہم یہاں وہاں پہنچے

ورنہ یہ وہ منزل ہے جس کو ڈھونڈنے والے کیا خبر کہاں پہنچے

گلستاں کو دیکھ آئی، کہکشاں سے ہو آئی، آسماں کو چھو آئی

اے نگارِ ناپیدا اب تمنا میں آرزو کہاں پہنچے

ہنس کے دیکھنے والے، تیری بیوفائی کا غم جہاں پہ لے آیا

اس مقام پر ہم کو اب نہیں گوارا یہ غم کو کچھ زیاں پہنچے

کاوشِ مسلسل کا کیا دیا صلہ مجھ کو تم سے کیا ملا مجھ کو

میں تو یہ سمجھتا تھا زیست مسکرا اُٹھی تم جہاں جہاں پہنچے

دوست کے تجسس میں ہم نکل گئے اکثر منزلوں سے بھی آگے
ساتھ چھوڑنے والو! اب تمہیں بتائیں کیا ہم کہاں کہاں پہنچے

نگہتیں یہ کہتی ہیں لالہ زار آرزو میں پھر بہار رسیدا ہے
حیف باغبانوں پر اس چمن میں اے آزاد! اب اگر خزاں پہنچے

رُباعی

اُلجھے وہ فضائیں ہلکے ہلکے بادل
لو شانۂ افلاک پہ ڈھلکے بادل
سرشار جہاں ہوا ہے دو چھینٹوں سے
ساغر کوئی چھلکا ہے کہ چھلکے بادل

اُمیدِ موہوم

سنہ ۱۹۴۰ء

یہ سماں دیکھ کے زنداں میں ہے تو مستِ خرام
کہ مٹا چاہتا ہے بزمِ گلستاں کا نظام

اس کی بربادی پہ یوں شاد نہ ہو مُرغِ قفس
کہ یہ ہنگامِ مسرت ہے نفس یا دو نفس

جن کے ہاتھوں سے ہے برباد گلستاں کی زمیں
وہ بھی تیرے لئے بیگانے ہیں اپنے تو نہیں

آکے تاراج کریں گے جو گلستاں تیرا
تو سمجھتا ہے کہ توڑیں گے وہ زنداں تیرا

آہ اے مرغِ قفس خام خیالی پہ نہ بھول
وہ بھی اپنے نہیں اغیار ہیں اغیار نہ بھول
دیکھ حالات یہ پیغام لئے آتے ہیں
وہ بھی ہم رنگِ زمیں دام لئے آتے ہیں
چمنستاں سے کے لئے ڈھول لئے آتے ہیں
تیرے زنداں کے لئے پھول لئے آتے ہیں
جن کی نکہت سے ترے گھر کو وہ مہکائیں گے
جن کی رنگت سے ترے دل کو وہ بہلائیں گے
زندگانی کے حوادث سے ڈرائیں گے تجھے
تجھ کو بیدار جو پائیں گے سُلائیں گے تجھے
تری اُمید سے مایوس کریں گے تجھ کو
ترے زنداں سے ہی مانوس کریں گے تجھ کو
یوں دلاویز بنے گی ترے زنداں کی فضا

کہ نہ آئے گی تجھے یادِ گلستاں کی فضا

پلٹ بھی جائے اگر آج اس چمنستاں کا نظام
پھر بھی تبدیل نہ ہوگا ترے زنداں کا نظام

کہ تہِ سقفِ فلک فطرتِ صیاد ہے ایک
شرق سے غرب تلک فطرتِ صیاد ہے ایک

یہ وہ شے ہے کہ بدلتی نہیں حالات کے ساتھ
غیر ممکن ہے اسے انس مساوات کے ساتھ

جب ہو دنیا میں خزاں اس کا چمن کھلتا ہے
اس کے بکھرے ہوئے جذبوں کو سکوں ملتا ہے

ہاں تو ٹھنے جو لگا ہے چمنستاں کا نظام
اپنے زنداں میں نہ ہو مرغِ قفس مستِ خرام

کسی انصاف کی صیاد سے امید نہ رکھ
کرم و رحم کی جلاد سے امید نہ رکھ

خارزاروں سے امیدِ گُلِ رنگیں ہے فضول
کبھی طوفاں سے بھی ہو سکتا ہے تسکیں کا حصول

متمنّی گہر و لعل کا ہے خاک سے کیوں
طالبِ رحم ہے تو گردشِ افلاک سے کیوں

کر نہیں سکتے نہ افلاک مداوا تیرا
ہے تری ضربتِ بے باک مداوا تیرا

غزل

نغمے چمن کی خاک پہ برسا رہا ہوں میں
پھولوں کو موجِ شوق سے مہکا رہا ہوں میں

کہ دی یہ میرے ہم سفروں کو پیام دے
کچھ دیر انتظار کریں آ رہا ہوں میں

اب محفلِ فنا بھی نگاہوں سے چھپ گئی
کتنی بلندیوں پہ اُڑا جا رہا ہوں میں

تہذیبِ کہنہ میری شرافت پہ ناز کر
دھوکا دیا ہے دوست نے شرما رہا ہوں میں

اک بے وفا کی نذر کر دوں پھر وقارِ عشق
کیا آرزو ہے جس پہ مٹا جا رہا ہوں میں

شبے زار نالید ابرِ بہار
کہ ایں زندگی گریۂ پیہم است
درخشید برقِ سبک سیر و گفت
خطا کردہ خندۂ یک دم است
ندانم بہ گلشن کہ برد ایں خبر
سخن ہا میانِ گل و شبنم است

شکنتلا

ریل گاڑی رک چلی ہے دھرم پور آنے کو ہے
ساغرِ لبریز آنکھوں کا چھلک جانے کو ہے
سلسلہ نانادتی کا ہے نظر کے سامنے
پھر وُہی تصویر کھینچی ہے سکوتِ شام نے
دیکھ لے اِک بار پھر اے دیدۂ خونبابہ بار
سامنے ہے زندگی کی آرزوؤں کا مزار
کیا خبر کس کیفیت میں گم ہوا جاتا ہوں میں
ایک طوفاں ہے کہ جس میں ڈوبتا جاتا ہوں میں

خامشی سے نالہ کش ہے خاطرِ اندوہ گیں

روح میں دھڑکن سی ہے جذبات پر قابو نہیں

نطق کو حاصل کہاں تابِ بیانِ زندگی

کہہ گئے آنسو چھلک کر داستانِ زندگی

اے پہاڑ والے گھٹاؤ! مجھ کو شکوہ تم سے ہے

اے سکوں پرور ہواؤ مجھ کو شکوہ تم سے ہے

اے کسولی کے دلارا کوہسارو کیا کیا

بادلوں کے اے جنوں پرور نظارو کیا کیا

ہر طرف اُتری ہوئی دلکش بہارو! کیا کیا؟

جنتِ چشمِ تماشا سبزہ زارو! کیا کیا

تم نے مل جل کر کسی کی نوجوانی چھین لی

ایک بیکس کی بہارِ زندگانی چھین لی

میری راحت اور میری شادمانی لوٹ لی

لوٹ لی میری متاعِ زندگانی لوٹ لی

چل کے اے خوشنما اونچے درختو! دیکھ لو
دور تک پھیلے ہوئے پھولوں کے تختو! دیکھ لو

میں نے کھایا ہے تمہاری دلربائی کا فریب
رنگ و بُو کا، تازگی کا، جانفزائی کا فریب

میں تو سمجھا تھا کہ مجھ پر رحم فرماؤ گے تم
اک فقیرِ بے نوا کو فیض پہنچاؤ گے تم

میں تو سمجھا تھا جسے لے کر یہاں آیا ہوں میں
موت کی یورش سے اب اُس کو چھڑا لایا ہوں میں

میں تو سمجھا تھا یہاں آ کر وہ راحت پائے گی
اور اُس کو یہ فضائے دلنشیں راس آئے گی

میں تو سمجھا تھا مقدر یاوری فرمائے گا
میری اُمیدوں کا سرمایہ نہ اُٹھنے پائے گا

کیا خبر تھی کامرانی آرزو سے دُور ہے
اور میری خوش نصیبی تم کو نا منظور ہے

اے درختو! میں تو سمجھا تھا کہ تم جھومو گے جب
ایک مُرجھائی ہوئی پتی کا مُنہ چومو گے جب
وہ تمہارے لمس سے اِک شادمانی پائے گی
شادمانی سے سرورِ زندگانی پائے گی
جب تمہارے سائے میں آرام فرمائے گی وہ
زندگانی کی نویدِ جانفزا پائے گی وہ
مجھ کو کیا معلوم تھا تم درد سے بے گانہ ہو
اپنی ہی دُنیا میں ہو گُم درد سے بے گانہ ہو
کیا خبر تھی تم پہ آہوں کا اثر ہوتا نہیں
اور غم دیدہ نگاہوں کا اثر ہوتا نہیں

چند گھڑیوں کے لئے جس پر تمہارا سایہ تھا
ہاں کسی برگشتہ قسمت کا وہی سرمایہ تھا
میں رفیقِ زندگی کو اس جگہ لایا تھا جب
اک مجسّم درد کی صورت یہاں آیا تھا جب
جب مری ہر سانس اک ٹوٹی ہوئی فریاد تھی
جب گرفتارِ مصائب فطرتِ آزاد تھی
روبرو آنکھوں کے جب امید بھی تھی یاس بھی
کارفرما نا اُمیدی بھی تھی اور تھی آس بھی
ہمتیں باقی تھیں اپنے حوصلے ٹوٹے نہ تھے
آبلے پاؤں میں تھے لیکن ابھی پھوٹے نہ تھے
التجا کی تھی کہ اے نیناوتی کے کوہسار
ملتجی ہوں میں ترے آگے بچشمِ اشکبار
جانفزا موسم سے یوں ارشاد فرما دے ذرا

اک مریضِ خستہ جاں کو فیض پہنچا دے ذرا

تو نے میری التجاؤں کی ذرا پروا نہ کی

درد میں ڈوبی دعاؤں کی ذرا پروا نہ کی

میرے آنسو پتھروں پر رائگاں گرتے رہے

ایک دنیا کی نگاہوں سے نہاں گرتے رہے

میں اُسے لے کر خدا جانے کہاں پھرتا رہا

پتھروں پر ڈگمگاتا جا بجا گرتا رہا

مجھ کو ہر تکلیف میں ہر رنج میں آرام تھا

دل میں دردِ دوست تھا لب پر خدا کا نام تھا

کون کر سکتا ہے لیکن اے اجل! تیرا علاج

جب نہ منظورِ مقدّر ہو تو پھر کیسا علاج

چاند تارو! یہ سماں کتنا الم آثار تھا

میری قسمت سو رہی تھی اور میں بیدار تھا

اے گرفتارِ تپ کہنہ اے قرارِ چشم و دل
ایک مدت تک رہی ہے تو علیل و مضمحل

ایک مدت تک تجھے درد و الم سہنا پڑا
دور گھر سے ہسپتالوں میں تجھے رہنا پڑا

تجھ کو ہر بد ذائقہ کڑوی دوا پینی پڑی
بارہا تو ں بیٹی پڑی سلے مدعا پینی پڑی

پھیپھڑے پر وہ ترے جرّاح کے نشتر کی ضرب
یاد ہے اس کی مرے احساس میں ہر درد و کرب

شکر ہے آخر حوادث کا یہ بادل چھٹ گیا
شکر ہے آخر ترا دورِ مصائب کٹ گیا

سامنے میرے دعاؤں کا مری انجام ہے
اب ترے ہر درد و تکلیف کو آرام ہے

اب نہ روٹھے گی تو اپنی بچیوں کو دیکھ کر
اور اُس معصوم کی خاطر نہ ترسے گی نظر
جو ترے دامن میں آیا مسکرایا، چل بسا
جس کو یہ انداز دُنیا کا نہ بھایا، چل بسا
اب نہ ہم کڑوے دوا دارو پلائیں گے تجھے
اب نہ بیماروں کے بستر پر سُلائیں گے تجھے
اے کہ گھبراتی تھی تو کڑوی دوا کے نام سے
آگ کے شعلوں میں جا سوتی ہو کس آرام سے
آسماں تک شعلے پہنچے اور تو نے اُف نہ کی
کس قدر حیران کُن ہے ارتقائے زندگی
عالمِ فردوس میں تو آج آرامیدہ ہے
میرے سینے میں تری یاد حسیں خوابیدہ ہے
روحِ باقی جا چکی ہے جسمِ فانی جل چکا

آج وہ میرا جہانِ شادمانی جل چکا
ہائے کیا نقشہ دکھایا گردشِ ایّام نے

تو نہیں ہے اور ہیں تیرے پھول میرے سامنے
چُن کے تیری راکھ سے یہ پھول لے آیا ہوں میں

گوہرِ اشکِ رواں دے کر انھیں لایا ہوں میں
بزمِ فانی کی کثافت سے نہ آلودہ رہیں.
پھول تیرے دامنِ گنگا میں آسودہ رہیں

ایک آرزو

اے شریکِ رنج و راحت! زندگانی کی رفیق
چارہ سازِ درد، میری شادمانی کی رفیق

میری آنکھوں کو ابھی تک وہ سماں بھولا نہیں
جب گرفتارِ گلو تھی تیری آوازِ حزیں

جب تری گفتار اک بھولا ہوا افسانہ تھا
ساز تھا لیکن حسیں آواز سے بیگانہ تھا

جب تری نبضیں مری انگلی تلے آتی نہ تھیں
جب تری سانسیں تری دنیا کو گرماتی نہ تھیں

آسمانوں تک دُعائیں میری جا سکتی نہ تھیں
تختِ اعظم کا کوئی پایہ ہلا سکتی نہ تھیں
نطق کی محتاج تھی جب میری فریادِ خموش
سوچنے کا عقل کو دل کو نہ تھا رونے کا ہوش
ایک شب کو جب اجل تیرے سرہانے آ گئی
جسم ٹھنڈا ہو گیا تیرا، نظر پتھرا گئی
دیکھتے ہی دیکھتے جب ہو گئی خاموش تو
میں نے دیکھا پھول باقی ہے مگر بے رنگ و بو

آج شاید تو مکان و لامکاں سے دور ہے
اس زمیں سے دور ہے اِس آسماں سے دور ہے
چاند تاروں سے پرے ہے کہکشاں سے دور ہے
عقل سے ادراک سے وہم و گماں سے دور ہے

حلقۂ روز و شب و شام و سحر سے دور ہے
تو جہاں بھی ہے مری حدِ نظر سے دور ہے

کیا خبر مسکن ہے تیرا آج کل کس دیس میں
کون سے خوابوں کی دنیا میں ہے کیسے بھیس میں

کیا خبر اس دیس کا کیا حال ہے کیا رنگ ہے
رہنے سہنے بات کرنے کا وہاں کیا ڈھنگ ہے

کاش مجھ کو تیری دنیا کا پتا دیتا کوئی
تو کہاں ہے مجھ کو اتنا ہی بتا دیتا کوئی

میں تو اتنا جانتا ہوں اے قرارِ چشم و دل!
اے مری حدِ نظر! اے انتظارِ چشم و دل!

جب چتا کی لکڑیوں پر سو گیا تیرا شباب
"کچھ نظر آیا نہ جز یک شعلۂ پر پیچ و تاب

شمع تک ہی میں نے یہ دیکھا کہ پروانہ گیا"
دُور تک گو جستجو میں شوقِ دیوانہ گیا

تو کہاں ہے اے مرے گلزارِ ہستی کی بہار
قسمت بیمار ہر دردِ نہاں کی چارہ کار
کیا صبا بن کر کسی گلشن میں آوارہ ہے تو
یا بسیرا کر لیا پھولوں کے دل میں مثلِ بو
یا فلک پر ہے کسی تارے کی تابانی میں گمُ؟
یا مرے افکارِ روشن کی درخشانی میں گمُ
مائلِ آرام تو مہتاب کے ایواں میں ہے؟
یا کہیں آسودہ میرے خاطرِ ویراں میں ہے؟
تیرے دل کو بھا گئی ہے کوئی خوابوں کی زمیں؟
یا پسند آ گئی ہے آوارہ سحابوں کی زمیں؟

ہو گئی تو آبشاروں کے ترنم میں مکیں؟

یا ٹھکانا کر لیا آوازِ بلبل میں کہیں؟

جس کو تو محبوب تھی تو اُس فضا میں تو نہیں؟

تو پہاڑوں کی جنوں پرور ہواؤں میں تو نہیں؟

دور اُفق کی منزلوں سے بھی کہیں تیرا ہے گھر؟

یا ہے تو خورشید کی پہلی کرن میں جلوہ گر

دیدۂ آہو میں ہے تو یا رمِ آہو میں ہے؟

کچھ بتا دے پھول میں یا پھول کی خوشبو میں ہے

برگِ گل پر قطرۂ شبنم کی بیتابی میں ہے؟

یا مرے سوکھے ہوئے آنسو کی نایابی میں ہے

آبِ گوہر میں ہے دریا کی روانی میں ہے تو

یا مرے ٹوٹے ہوئے دل کی کہانی میں ہے تو

تتلیوں کے خوشنما رنگوں میں آر امیدہ ہے

دولت کی پرواز کے دامن میں یا خوابیدہ ہے

جنّتِ گُم گشتہ! پوشیدہ ترا زکیفِ بہار!

جستجو میں تھک گئی ہے میری چشمِ انتظار

اے کہ تجھ کو ڈھونڈتی ہے میری جانِ دردمند

اے کہ اک پل کی جدائی بھی نہ تھی تجھ کو پسند

ہو سکے تو میری خلوت گاہ میں پھر آ کبھی

خاطرِ اندوہگیں کو شادماں فرما کبھی!

آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست

یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے

غزل

قرنوں سے بچھڑے تھے جو انساں آج وہ باہم ایک ہوئے
وقت نے ایسی کروٹ بدلی پورب پچھم ایک ہوئے

کس کا فیض ہے؟ لڑنے والے آج لڑائی بھول گئے
ایک ہوئی دونوں کی مسرت دونوں کے غم ایک ہوئے

بس اتنی روداد ہستی ہے روٹھ کے ملنے والوں کی
آگ بھرے دل سے روٹھے با دیدۂ پُرنم ایک ہوئے

انسانوں کو بانٹنے والو چال تم اپنی ہار گئے
دل کے ارادے یہ کہتے ہیں بٹ کر بھی ہم ایک ہوئے

رنگ الگ تھے تیور اور تھے اپنی رنعت بھی
ایک بلندی پر جب پہنچے سارے پرچم ایک ہوئے

رُباعی

ہر شے کا ہے انداز بدلنے والا
ہر خار ہے گلشن سے نکلنے والا
مشرق کی طرف دیکھ کہ تاریکی میں
اک نور کا چشمہ ہے اُبلنے والا

وطن میں آخری رات

ہر طرف ایک پُر اسرار خموشی ہے محیط
نہ وہ بیباک سا ٹھہراؤ نہ بدمست خرام
ہو گئے کون سی راتوں کا خطرناک نصیب
وہ چھلکتے ہوئے ساغر وہ کھنکتے ہوئے جام

اس سے پہلے بھی کئی بار یہاں آیا ہوں
حسن نے منزلِ عشرت میں اُتارا ہے مجھے
منتظر جھومتی باہوں کا اشارہ پا کر

ذرّے ذرّے نے بہ ہر گام پکارا ہے مجھے

نغمہ آباد میں یہ شہرِ خموشاں سا سکوت
زندگانی پہ عجب موت نے ڈالا سایہ
کان میں دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
مجھ کو اے جذبۂ مشتاق کہاں لے آیا

نہ سہی حاصلِ ہر شوق یہ دنیا لیکن
اپنے سائے سے کبھی آپ ہراساں تو نہ تھی
خوف سے سینۂ احساس دھڑکتا تو نہ تھا
زندگی آپ ہی جلووں سے گریزاں تو نہ تھی

آج یہ لرزہ براندام اُجالا لیکن

آپ ہی اپنے سمٹتا سا چلا جاتا ہے
کوئی برچھی کوئی خنجر کوئی پتھر کوئی اینٹ
میرے احساس کو ماحول سے خوف آتا ہے

قہقہے کتنے ترے سامنے دم سادھ گئے
اپنے اطوار ذرا دیکھ حکومت کی ہوس
کتنی ہنستی ہوئی گلیاں تھیں کہ ویران ہوئیں
یوں ترے شور سے جل گئے ہیں اسیرانِ قفس

غزل

بس ایک نور جھلکتا ہوا نظر آیا
پھر اس کے بعد نہ جانے چمن پہ کیا گذری

میں کاش تم کو بھی اہلِ وطن بنا سکتا
وطن سے دور کسی بے وطن پہ کیا گذری

جدا جب اس سے ہوئے اہلِ کو غرورِ تسنیم
نہ پوچھ عالمِ گنگ و جمن پہ کیا گذری

مرے چمن میں بھی آئی تو تھی بہار مگر
میں کیا بتاؤں کہ اہلِ چمن پہ کیا گذری

یہ راز فاش تو کر مجھ پہ اے نسیمِ سحر
یہ بات کیا ہے یہ سرو و سمن پہ کیا گذری

وہ انجمن کہ جو کی تھی خلوص نے تعمیر
نہ پوچھ مجھ سے کہ اس انجمن پہ کیا گذری

خموش کیوں ہیں قتیل و ندیم کچھ تو کہیں
ہمارے بعد ہمارے وطن پہ کیسا گذری

سبھاش چندر بوس

بہادر شاہ ظفر کے مزار پر

السلام اے تاجدارِ کشورِ ہندوستاں
اے شہید! اے جانِ سپارِ کشورِ ہندوستاں

السلام اے عظمتِ ہندوستاں کی یادگار
اے شہنشاہِ دیارِ دل! فقیرِ بے دیار

آج پہلی بار تیری قبر پہ آیا ہوں میں
بے نوا ہوں نذر کو بے لوث دل لایا ہوں میں

سُرمۂ چشمِ بصیرت اے ترے مرقد کی دھول
اِک فقیرِ بے نوا کا ہدیۂ دل ہو قبول

گردشِ تقدیر کے باعث وطن سے دور ہوں
ایک بلبل ہوں مگر صحنِ چمن سے دور ہوں
شوق آزادی کا مجھ کو کھینچ لایا ہے یہاں
آج دشمن ہے زمیں میری عدو ہے آسماں
میں بھی ہوں اپنے وطن سے دور تو بھی دور ہے
ہاں رضائے پاکِ یزداں کو یہی منظور ہے
اے شہیدِ جنگِ آزادی! اے شہنشاہِ وطن!
میں بھی آیا ہوں یہاں باندھے ہوئے سر سے کفن
میں نے بھی تلوار اٹھائی ہے تری تقلید میں
اور لاتعداد بازو ہیں مری تائید میں
میرا دامن بھی یہاں کی خاک سے آلودہ ہے
فرق صرف اتنا ہے میں آوارہ تو آسودہ ہے

اے شہِ خوابیدہ! اے تقدیرِ بیدارِ وطن
آئینہ میری نگاہوں پر ہے ادبارِ وطن

میرے دل کو یاد ہے اب تک وہ ساون کی جنگ
جس کے بعد اس سرزمیں پہ چھا گئے اہلِ فرنگ

میری نظروں میں ہے میرٹھ اور دہلی کا زوال
جانتا ہوں میں جو تھا جھانسی کی رانی کا مآل

میں نہیں بھولا ابھی انجامِ نانا فرنویس
ہے نظر میں کوششِ ناکامِ نانا فرنویس

داستاں جیسے بھی ہو گزری وہ سب معلوم ہے
تیرے دلبندوں پہ جو گزری وہ سب معلوم ہے

ہاں تو اے سرمایہ دارِ عزتِ ہندوستاں
اے ترے دم سے ہے قائم سطوتِ ہندوستاں

خاک تیری قبر کی میری زیارت گاہ ہے
آج اسی مٹی سے میرے دل کو رسم وراہ ہے
سرمۂ چشمِ بصیرت ہی ترے مرقد کی خاک
خاک ہے یہ سرزمینِ ہند کی مانند پاک
آج اسی مرقد پہ اپنا عزم دہراتا ہوں میں
دیس پر قربان ہونے کی قسم کھاتا ہوں میں

اے شہ ہندوستاں اے لال قلعے کے مکیں
آسماں ہونے کو ہے پھر اس وطن کی سرزمیں
یہ وطن روندا ہے جس کو مدتوں اغیار نے
جس پہ ڈھائے ظلم لاکھوں چرخ ناہنجار نے
مدتوں جس کو رکھا قسمت نے ذلت آشنا
جس نے ہر پہلو میں دیکھی پستیوں کی انتہا

آج پھر اس ملک میں اک زندگی کی لہر ہے

خاک سے افلاک تک تابندگی کی لہر ہے

آج پھر اس ملک کے لاکھوں جواں بیدار ہیں

حرّیت کی راہ میں مٹنے کو جو تیار ہیں

آج پھر ہے بے نیام اس ملک کی شمشیر دیکھ

سونے والے جاگ اپنے خواب کی تعبیر دیکھ

اس طرح لرزے میں ہے بنیادِ ایوانِ فرنگ

کھا چکے ہیں مات گویا شیشہ بازانِ فرنگ

حبِّ قومی کے ترانوں سے ہوا لبریز ہے

اور توپوں کی دنا دن سے فضا لبریز ہے

شورِ گیر و دار کا ہے پھر فضاؤں میں بلند

آج پھر ہمت نے پھینکی ہے ستاروں پر کمند

پھر امنگیں آرزوئیں ہیں دلوں میں بے قرار

قوم کو یاد آگیا ہے اپنا گم گشتہ وقار

نوجوانوں کے دلوں میں سرفروشی کی امنگ

عشق بازی لے گیا ہے عقل بیچاری ہے دنگ

آج پھر اس دیس میں جھنکار تلواروں کی ہے

کچھ نرالی کیفیت پھر دیس کے پیاروں کی ہے

جو توانائی ارادوں میں ہے کہساروں کی ہے

ذرّے ذرّے میں نہاں تابندگی تاروں کی ہے

یہ نظارہ آہ لفظوں میں سما سکتا نہیں

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

فتح و نصرت کی دعاؤں سے ہوا معمور ہے

نعرۂ "جے ہند" سے ساری فضا معمور ہے

مجھ کو اے شاہِ وطن! اپنے ارادوں کی قسم

اور ہم آغوشِ اجل سرہنگ زادوں کی قسم

تیرے مرقدِ مقدس خاک کی مجھ کو قسم
میں جہاں ہوں اُس فضائے پاک کی مجھ کو قسم
اپنے بھولے جاں بلب بنگال کی مجھ کو قسم
اور اس صوبے کے ظالم کال کی مجھ کو قسم
لال قلعے کی، زوالِ شہرِ دہلی کی قسم
حاکمِ دہلی! تا لِ شہرِ دہلی کی قسم
میں تری کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لاؤں گا
اور ترے مرقد پہ نصرت یاب ہو کر آؤں گا
تیغِ ہندی جس کا لوہا مانتا ہے اک جہاں
جس کی تیزی کی گواہی دے رہا ہے آسماں
تیغِ ہندی جس کو میں نے کر دیا ہے بے نیام
جس کا شیوہ حریت کیشی جہانگیری ہے کام
جس نے پوری منصفی کی آج تک دنیا کے ساتھ

ظلم کی دشمن ہے جو اک ظلم بے پروا کے ساتھ
ہر قدم پر جس نے باطل کو ملایا خاک میں
جس کی بے باکی کا ہے اک شور سا افلاک میں
آج پھر اپنی نظر جس کی چمک سے خیرہ ہے
جس کی تابانی سے روشن ایک جہان تیرہ ہے
اک جزیرے کے حسیں ساحل سے جب ٹکرائے گی
چین سے مجھ کو بھڑکتی آگ میں نیند آئے گی

آزاد ہند فوج ○

۱۹۴۴ء

پائندہ باد ہند کی اے فوجِ خوش نہاد!

وہ دن خدا کرے کہ بر آئے تری مراد

مٹ جائے بزمِ دہر سے یہ جنگ یہ فساد

زنداں کو توڑ پھوڑ دے اے حرّیت نژاد ــــ

اب وقت آگیا ہے کہ ہو عازمِ جہاد

ہندوستان کی فوجِ ظفر موج زندہ باد

پرچم ترا ہو چاند ستاروں سے بھی بلند

پہنچا سکے نہ دورِ زمانہ تجھے گزند

○ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

اغیار کر سکیں نہ کبھی تجھ پہ راہ بند
پسپائیاں ہوں تیرے جوانوں کو ناپسند
تو کامراں ہو اور عدو تیرے نامراد
ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد!

"جے ہند" کی صداؤں میں تیرے جواں بڑھیں
ہاتھوں میں لے کے امن و اماں کا نشاں بڑھیں
نصرت نصیب ان کے قدم ہوں جہاں بڑھیں
بہرِ وقارِ عظمتِ ہندوستاں بڑھیں
دنیا کو بھی وہ شاد کریں ہند کو بھی شاد
ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد!

غزل

خرد کا سفینہ جنوں کے ہیں دھارے
کبھی اس کنارے کبھی اُس کنارے

نگاہیں تھیں اور مہوشوں کے نظارے
کچھ ایسے بھی ایام ہم نے گذارے

محبت کا دریا وفا کا سفینہ
یہ بے باک موجیں یہ بے تاب دھارے

فقط اک نظر کے ہیں محتاج اے دل
یہ رنگیں شفق یہ حسیں چاند تارے

کٹھن منزلیں تھیں وفاؤں کی لیکن
میں بڑھتا گیا بے خودی کے سہارے
تری جستجو میں مری آرزو نے
بہت رنگ بدلے بہت روپ دھارے
عجب شے ہے آزاد! ذوقِ نظر بھی
ہوئیں منزلیں طے اسی کے سہارے

اے دل!

رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک نظم

ہو ذوق و شوق کی منزل کا رہ سپار اے دل
جو رہ گئے ہیں نہ کر اُن کا انتظار اے دل
ہے صبح محفلِ عالم میں جلوہ کار اے دل
فلک پہ ذکر ہوا تیرا بار بار اے دل

شب سیاہ میں حاصل ہوں شبنمی گوہر
یہی ہے آرزوئے غنچہ کا کمال مگر

کمالِ آرزوئے گُل وصالِ نورِ سحر
وجودِ تیرہ سے تو بھی ہو آشکار اے دل

ہو ذوق و شوق کی منزل کا رہ سپار اے دل
جو رہ گئے ہیں نہ کر ان کا انتظار اے دل

غزل

دنیا ہے اک محفلِ عشرت دُنیا ہے اک غم خانہ
یوں بھی دل کا افسانہ ہے یوں بھی دل کا افسانہ

ایک سمجھتا ہے دیوانہ کعبہ ہو یا بت خانہ
یہ اک خلوتِ جانانہ ہے وہ اک جلوتِ جانانہ

کیونکر ہو مفقود رقابت شیخ و برہمن میں آخر
یہ بھی تیرا دیوانہ ہے وہ بھی تیرا دیوانہ

دل بھی ایک عجب بستی ہے دنیا کے معمورے میں
آبادی کی آبادی ہے ویرانے کا ویرانہ

میرے دل میں بسنے والے! آنکھوں سے کیوں دور ہے تو
آنکھ بھی تیرا کاشانہ ہے دل بھی تیرا کاشانہ
تو بھی اے آزاد! عجب انساں ہے فانی دنیا میں
بزم کی بزم ہے شمع کی شمع ہے پروانے کا پروانہ

کنارِ راوی

یہ وقتِ شام یہ آبِ رواں یہ تنہائی
سکوتِ شام میں قدرت کی محفل آرائی
فضا میں تین طرف سے ہجوم ظلمت کا
اور ایک سمت شفق کا وہ رنگِ زیبائی
بجھی وہ چشم زدن میں شفق کی شمعِ حیات
فلک پہ چار طرف گھر کے تیرگی چھائی
وہ تیرگی کے نظارے کا رنگ و کیف بڑھا
سجی حسین ستاروں سے سقفِ مینائی

وہ بزمِ عالمِ بالا میں جلوہ مہتاب
زمیں کا حسن بڑھانے کو چاندنی آئی

ٹھہر کہ راہزنِ صبر و ہوش ہے رادی
خرامِ ناز ترا اور شانِ برنائی

ہر ایک موج سے اندازِ دلکشی ظاہر
ہر اک حباب سے بے پردہ رازِ رعنائی

یہ شامِ دشت یہ اُس پر سکوتِ سحر آمیز
فضا میں ہو کسی ساحر کی کار فرمائی

یہ شہد رے کی خموشی میں نوحہ خواں مینار
کہ جن کے سائے میں اک بادشہ کو نیند آئی

شکستہ حال سرِ راہ ایک بارہ دری
جہاں ہو نورِ جہاں وقفِ کُنجِ تنہائی

کہاں وہ شانِ حکومت کہاں وہ کیفِ حرم

کہاں وہ بزمِ شہی کا جلالِ دارائی
کہاں یہ دشتِ مغیلاں کہاں وہ بسترِ گل
کہاں سے آہ اسے بے کسی کہاں لائی
کہاں وہ محفلِ رنگیں کہاں وہ بزمِ نشاط
کہاں یہ عالمِ ہو اور فضائے صحرائی
ٹھہر ٹھہر دلِ شاعر! یہ وہ نظارہ ہے
کہ جس کے چاند ستارے بھی ہیں تماشائی
تماشاگاہِ زمانہ کو دیکھنے والے!
یہ دیکھ خاک میں سوتا ہے نورِ سینائی
مری نگاہ میں اے کاش نیند بھر دے کوئی
نہیں ہے چشمِ نظارہ کو تابِ بینائی

یہ نظم میرے دورِ جہالت کی یادگار ہے۔ اب میں اس نظریے کا قائل نہیں ہوں۔

غزل

جب جوشِ جنوں ہو گرمِ سفر وہ بند و سلاسل کیا جانے
طوفان جب اپنی موج میں ہو پابندیٔ ساحل کیا جانے

جو برق میں ضو ہے شمع میں لو پارے میں تڑپ کوندے میں لپک
پابندِ طلسمِ دیر و حرم وہ درد ترا دل کیا جانے

وہ عزم ہے جو لے آتا ہے قدموں تک کھینچ کے منزل کو
اس راز کو رہبر کیا سمجھے اس بھید کو منزل کیا جانے

ہر گام پہ کیوں بل کھا کھا کر بیتاب بگولے اٹھتے ہیں
محمل کو اس کی خبر کیا ہے اس بات کو محمل کیا جانے

منجدھار میں جب پہنچی کشتی کشتی والوں پر کیا گذری
یہ طوفانوں کی باتیں ہیں آسودۂ ساحل کیا جانے

جب عشق ہو اپنی دھن میں رواں بےخوف خطر منزل کی طرف
وہ راہ کی مشکل کیا سمجھے وہ دوریِ منزل کیا جانے

آزاد ہے محوِ جہد و عمل انجام پہ کب ہے اس کی نظر
یہ کشتِ عمل کا دیوانہ اس کشت کا حاصل کیا جانے

ماتمِ اقبال

پھر نالہ ہائے غم سے ہے لبریز دل کا ساز
پھر ہو گیا ہے دیدۂ حیراں گہر طراز
وہ حق شناس فلسفی و مردِ نکتہ داں
وہ باکمال شاعر و درویشِ پاکباز
نغمے تھے جس سخنورِ عالی دماغ کے
مشرق میں دلپذیر تو مغرب میں جاں نواز
تیرِ اجل نے اُس کو نشانہ بنا لیا
تھا ہم کو آہ جس کے کمالِ سخن پہ ناز

محفل سے آج ساقیٔ محفل ہی اُٹھ گیا

آزاد اب کہاں وہ شرابِ جگر گداز

ہر بزم وقفِ نالۂ غم ہے ہزار حیف

خونابہ بار دیدۂ نم ہے ہزار حیف

اقبال! اے جہانِ معانی کے تاجدار

اے رومی و ثنائی و غالب کی یادگار

معنی کو تجھ پہ فخر تخیل کو تجھ پہ ناز

نازاں تھا تجھ پہ مشرق و مغرب کا ہر دیار

آتش کا سوز، گُل کی مہک برق کی تڑپ

سو جاں سے ہو گئے تری تخئیل پر نثار

تو نے سخن کو زندۂ جاوید کر دیا

تیرے نفس نے دی چمنِ شعر کو بہار

دو گز زمین آہ تجھے راس آ گئی

شہرت پہ تیری تنگ تھا دامنِ روزگار

گو زیرِ خاک کالبدِ خاک آ گیا

تو رُوح بن کے عالمِ جاں میں سما گیا

اے مزرعِ سخن پہ برستے ہوئے سحاب

اے مطلعِ وطن کے درخشندہ آفتاب

جاں بخش تیری نظم کا ہر استعارہ ہے

ہر لفظ بے مثال ہے ہر شعر لاجواب

اب آ کے کون دے گا گُلِ شعر کو مہک

بخشے گا کون گوہرِ معنی کو آب و تاب

کہتے ہیں ترجمانِ حقیقت بجا تجھے

ہر رازِ حق تھا دیدۂ باطن پہ بے نقاب

رتبہ تری خودی کا نہایت بلند تھا
تجھ سے ترے خدا نے کیا بار ہا خطاب
اِس دور میں تو آگہِ رازِ قدیم تھا
جو ہو حریفِ جلوۂ حق وہ کلیم تھا

جس کی صداؤں پر ہمہ تن گوش تھے سروش
وہ جامِ رُوح پرورِ عرفاں کا بادہ نوش
جس کی نوا سے نادرِ افغاں تڑپ اُٹھا
اُف ہو گیا وہ شاعرِ آتش نوا خموش
رنگین تھا جس کے حُسنِ تخیّل سے برگِ گُل
جس کی گرج سے موجۂ طوفاں میں تھا خروش
سینوں میں جس نے قوّتِ گفتار سے بھرا
صہبائے بیخودی کا سرودِ عمل کا جوش

تھا جس کے سانس سانس میں میخانۂ حیات

تربت ہے اس کی سایۂ مسجد میں سبز پوش

ہے خاک میں وہ عرشِ معانی ہزار حیف

اے انقلابِ عالم فانی ہزار حیف!

○

ہر شوق ہے شیدائے کلامِ اقبال

ہر فکر ہے وارفتۂ نامِ اقبال

کیا خوب گرامی نے کہا ہے آزاد

شہباز زمانیست بدامِ اقبال

غزل

دِل کی بلندیوں پہ بھی برقِ نظر گرا کے دیکھ
طور کو آزما لیا مجھ کو بھی آزما کے دیکھ

عشق کی رزم گاہ میں کتنا سُرور کیف ہے
عقل کی بزم گاہ سے دامنِ دل ہٹا کے دیکھ

کیفیتِ ظن و گماں لطفِ یقیں سے کم نہیں
بزمِ گماں کا رنگ و نور شمعِ یقیں بجھا کے دیکھ

علم ہے کیفِ بے ثبات عشق ہے گرمیٔ حیات
زیست کی یہ حقیقتیں دل کے قریب آ کے دیکھ

گُم شدگی

رہِ سفر میں ہمسفر! یہ کیا مقام آگیا
تڑپ اٹھی امید، حوصلہ شکست کھا گیا
خبر نہیں تری نگاہ میں یہ کیا سما گیا

خرد جہانِ انتشار میں اُلجھ کے رہ گئی
نظر طلب کے خارزار میں اُلجھ کے رہ گئی
کبھی خزاں کبھی بہار میں اُلجھ کے رہ گئی

کچھ اُس مقام کا پتہ نہ چل سکا جہاں ہے تو
جو ابتدا میں ختم ہو گئی وہ داستاں ہے تو

خبر نہیں کہاں ہے تو خبر نہیں کہاں ہی تو

ترا نشاں نہ مل سکا فضائے قرب و دور میں
ستارۂ امید کھو گیا ہجومِ نور میں
چمک کرن کی غرق ہو گئی ضیائے طور میں

○

اپنے جلووں کو مری حدِ نظر سے نہ چھپا
کہ صلہ چاہتی ہے میری پریشاں نظری

غزل

اب یاد نہیں ہر صبح تری اب ذکر نہیں ہر شام ترا
اس پر بھی مگر آجاتا ہے اے دوست زباں پر نام ترا

اے نور کے خوگر سامنے تو اک نور کا دریا بہتا ہے
اے صبح کے تارے تجھ کو بھی معلوم ہے کچھ انجام ترا

الفت میں سراپا درد بنا اب اور تمنا کیا ہے تری
اے درد پہ مٹنے والے دل! اب درد ہی خود انعام ترا

اے جوشِ جنوں ادراک نے تو ہر گام پہ ٹھوکر کھائی ہے
گو اس نے سنی آواز تری سمجھی نہ مگر پیغام ترا

آزاد کو جانے کیا سمجھے ہر بلبل چمن میں بول اٹھا
ہم چاک گریباں والوں کی محفل میں بھلا کیا کام ترا

میں اور تو

میں تجھ سے کہیں دور رہوں ناممکن
بدگوئی کبھی تری سہوں ناممکن
لیکن تو اگر کہے کہ تیری خاطر
میں خر کو کبھی اسپ کہوں ناممکن

دائرے

دائرے بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِّ نظر
اُجلے اُجلے دُھندلے دُھندلے ٹُوٹتے دائرے
کون سے نقطے سے ہے آغاز ان کا کیا خبر
اور کہاں انجام ہے یہ بات بھی پوشیدہ ہے

دائرے ہیں یہ کہ زنجیریں تخیّل کے لئے
فکر کو پابند کرنے میں جو ہیں ناکامیاب
دائرے ہیں یہ کہ سیمیں جال ہیں پھیلے ہوئے

طائرِ ادراک جس سے اُوڑ رہا ہے دُور دُور

دائرے — روشن کہیں دُھندلے کہیں دھبل کہیں
جیسے ماضی کے دھندلکوں میں نُمایاں ہو کبھی
یاد اُن بھولے ہوئے بسرے ہوئے احباب کی
گردشِ دورِ زماں نے آج پھینکا ہے جنھیں
دور آنکھوں سے تمنّا کی رسائی سے پرے

دائرے تابندہ و رخشندہ و بے نور سے
ہاں یونہی بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِّ نظر

دائرے — اُلجھے ہوئے باہم، سمٹتے پھیلتے
تیز رفتار ان میں کوئی اور کوئی سُست رو

پھر بھی سب باہم رواں اندازِ ہم آہنگ سے
ابتدا اور انتہا کی قید سے آزاد ہیں
چشمِ بینا کو گماں ہوتا ہے ان کو دیکھ کر

دائرے — جن کے تسلسل کا سرا نایاب ہے
بس یونہی بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِ نظر

دو شعر

عزمِ سفر ذرا ابھی اور بھی تیز تیز چل
عقل کی انتہا ہے کیا عقل فقط گرہ کشا

تیرا مقام ذوق و شوق دور بھی ہے بلند بھی
عشق گرہ کشا بھی ہے اور گرہ پسند بھی

سکوت

وقت نے باغ میں چھیڑا ہے پھر افسانۂ حسن
چاندنی رات ، دلآویز فضا
زرد مردہ کاہکشاں
پھول ــــــــ بشاش و ملول
چند خاموش سے کردار ہیں افسانے کے
یہ فسانہ کہ کسی قید کا پابند نہیں
یہ فسانہ کہ ازل سے ہے ابد تک جاری
چھا گیا آج کی رات

بن کے احساس دلِ شاعر پر
جاذبیت کا وہ عالم ہے اِس افسانے میں
کہ گماں ہوتا ہے
میں بھی اک جزو ہوں شاید اسی افسانے کا

○

بہار آئی ہے اور میری نگاہیں کانپ اُٹھی ہیں
یہی تیور تھے موسم کے جب اُجڑا تھا چمن اپنا

غزل

ممکن نہیں کہ بزمِ طرب پھر سجا سکوں
اب یہ بھی ہے بہت کہ تمہیں یاد آ سکوں

یہ کیا طلسم ہے کہ تری جلوہ گاہ سے
نزدیک آ سکوں نہ کہیں دور جا سکوں

ذوقِ نگاہ اور بہاروں کے درمیاں
پردے گرے ہیں وہ کہ نہ جن کو اٹھا سکوں

تاروں کی گردشوں کا اڑاؤں مذاق میں
میں تم کو ایک بار جو واپس بلا سکوں

کس طرح کر سکو گے بہاروں کو مطمئن
اہلِ چمن جو میں بھی چمن میں نہ آسکوں

اس بزم میں جہاں نہ عدم ہے نہ ہی قتیل
میرا قصور کیا جو ترانے نہ گا سکوں

تری حسین فضائیں مرے نئے وطن
ایسا بھی ہے کوئی جسے اپنا بنا سکوں

آزاد! سازِ دل پہ ہیں رقصاں وہ زمزمے
خود سن سکوں مگر نہ کسی کو سنا سکوں

نیا دور — نئے رہزن

یہ کوئی خاص بڑی بات نہیں ہے اے دوست!
چور گلشن سے اگر پھول چرا لیتے ہیں
حادثہ ہے یہ مگر اس پہ تعجب تو نہیں
راہ زن قافلے والوں کو اڑا لیتے ہیں

اس نئے دور میں دیکھے ہیں وہ رہزن ہم نے
جو بہاروں کو گلستاں سے چرا لے جائیں
دیدۂ نگاہوں کو جو دھوکا تو پتہ بھی نہ چلے

اور صفِ انجمِ تاباں سے اُڑا لے جائیں

اس طرح ان کی نظر پھول پہ ڈاکہ ڈالے
پھول موجود رہے پھول میں خوشبو نہ رہے
حرص کی آنکھ سے وہ تیری طرف دیکھ جو لیں
ترا پیکر رہے موجود مگر تو نہ رہے

قعرِ دریا میں اُتر جائیں تو انجام یہ ہو
قعرِ دریا میں صدف تو رہے گوہر نہ رہے
اور مائل جو ترے ذہن پہ ہو ان کا دماغ
ذہن میں تیرے غرض تو رہے جوہر نہ رہے

اس نئے دور میں کہنا ہے یہی تجھ سے مجھے

غزل

کہوں کیا کہ عشق کیا ہے عجب اس کا ہے فسانہ
کبھی زیست کا سہارا، کبھی موت کا بہانہ

ترے آستاں کو چھوڑا تو ملا نہ پھر ٹھکانہ
وہی کاوشِ مسلسل، وہی گردشِ زمانہ

کبھی گلستاں کو جانچا، کبھی کہکشاں کو پرکھا
مرے ذوقِ جستجو کو نہ ملا کوئی ٹھکانہ

یہ چمن بھی کیا چمن ہے نہیں، ہمصفیر کوئی
میں سناؤں بھی تو کس کو یہ نوائے عاشقانہ

کہ ترا ہوش رہے راہزنوں سے محتاط

تری محنت جو ترے حق میں ہو سامانِ الم

ہو کہیں اور نہ وہ خالقِ سامانِ نشاط

تجھے کیا بتاؤں ہمدم! کہ قفس میں کیا کشش تھی

یہ بجا مری نظر سے نہ پرے تھا آشیانہ

یہ بھیگی بھیگی فضائیں یہ گھٹا گھٹا سا عالم

مرے نطق! چھیڑ کوئی طرب آفریں ترانہ

نہ الم ہے دوش کا کچھ، نہ کچھ اشتیاقِ فردا

یہ جو آج سامنے ہے یہی ہے مرا زمانہ

شاعر

تجھ کو قُدرت نے اگر بخشا ہے قلبِ دردمند
تُو اگر شاعر ہے اور تجھ کو صداقت ہے پسند
تو ذرا تھم اور توجہ سے مری آواز سُن
ہاں مری آواز یعنی وقت کی آواز سُن
خطّۂ کشمیر میں جو کچھ ہوا اُس کو نہ دیکھ
صبح کی تنویر میں جو کچھ ہوا اُس کو نہ دیکھ
مرزبینِ کشورِ پنجاب کے نالے نہ سُن
عقل کے شیون دلِ بیتاب کے نالے نہ سُن

کان تو ہرگز نہ دے بیواؤں کی فریاد پر
اور یتیموں کی فغاں سے بے نیازانہ گزر

بھول کر بھی تو نہ ڈال ارضِ فلسطیں پر نگاہ
تاکہ سہواً بھی ترے دل سے نہ نکلے ایک آہ

سامنے گر چین کا نقشہ بھی ہو پروا نہ کر
ہند چینی کے مقدر کا خیال اصلا نہ کر

وقت لے آئے جو تیرے سامنے تصویرِ دہر
صاف کہہ دے کام شاعر کا نہیں تعمیرِ دہر

قتل و خونِ یونان کا، ایران کا یہ پیچ و تاب
جنگِ برما خاکِ انڈونیشیا کا اضطراب

یہ تماشے دیکھتا جا اور منہ سے کچھ نہ کہہ
سینۂ گیتی دھڑکتا دیکھ اور خاموش رہ

اور اگر کہنا ہو کچھ اپنے وطن کی شان میں

راز کی اک بات میں کہتا ہوں تیرے کان میں
یہ نہ کہہ انگریز بد باطن کا ہی سارا قصور
بلکہ ہندو ہے تو کہہ یہ ہے مسلماں کا قصور
اور سمجھتا ہے تو اپنے آپ کو مسلم اگر
تو مناسب ہی کہ سب الزام دے ہندو کے سر
دیکھ اپنے آپ کو شہری نہ دنیا کا سمجھ
قوم کی زنجیر میں جکڑا ہوا بندہ سمجھ
بس سخن گوئی کا یہ معیار یہ پیمانہ ہو
تو اگر قائل نہیں اس کا تو پھر دیوانہ ہے
ہاں اسی معیار سے عالم کے ہر پہلو کو ناپ
زندگانی کی خوشی اور غم کے ہر پہلو کو ناپ
اس سے تیرا قوم میں اونچا نشاں ہو جائے گا
کامراں فن ہو نہ ہو تو کامراں ہو جائے گا

غزل

نہ پہنچیں گی نگاہیں ماورائے آسماں کب تک

رہے گا راہ میں حائل غبارِ کہکشاں کب تک

وطن کہتے تھے جس کو چھٹ گیا اب دیکھنا یہ ہے

کہ رہتے ہیں دیارِ غیر میں ہم میہماں کب تک

قفس کی دلکشی میں تو کمی کوئی نہیں لیکن

نہ آئے گی قفس میں رہ کے یادِ آشیاں کب تک

ذرا اتنا تو فرما دے کہ منزل کی تمنا میں

بھٹکتے ہم پھریں گے اے امیرِ کارواں کب تک

زباں بن کر شہیدوں کا لہو اک دن پکارے گا
رہے گی شاخ آہو پر برات عاشقاں کب تک

خزاں آئی گلستاں میں تو ہم سمجھے بہار آئی
نگاہِ شوق آخر یہ تری خوش فہمیاں کب تک

زباں سے آگ برسانا پڑے گی اس گلستاں میں
یہاں اے ہم نفس پابندیٔ رسمِ فغاں کب تک

یہ ذوق و شوق بحرِ عشق میں اے کودنے والے!
یہ عالم ہے تو پھر اندیشۂ سود و زیاں کب تک

ذرا سوچو تو اے منزل کا رستہ بھولنے والو!
بالآخر آزماؤ گے جفائے دشمناں کب تک

یہ اپنی منزلِ مقصود پر کب تک نہ پہنچے گا
فریبِ رنگ و بو کھائے گا آخر کارواں کب تک

بشر کو بھی کبھی تو مورِدِ الزام ٹھہرا دے

یہ ناداں شکوۂ جور و جفائے آسماں کب تک

تعجب ہی یہ خود باغبانوں کو نہیں اس کا

رہے گا اس طرح برہم مزاجِ بوستاں کب تک

اسیرانِ طلسمِ وہم سے آزاد یہ کہہ دو

یہ رنگ و نور و نکہت کا ہجومِ بیکراں کب تک

آزاد و اقبال

آزاد

ذلیل و خوار ہیں اہلِ ہنر کیوں
جہاں نا قدرداں ہے اس قدر کیوں
جو کوسوں دور ہیں علم و ہنر سے
وہی ہیں صاحب لعل و گہر کیوں

اقبال

قماش و نقرہ و لعل و گہر چیست
غلام خوش گل و زرین کمر چیست
چو یزداں از دو گیتی بے نیاز ند
دگر سرمایۂ اہلِ ہنر چیست

غزل

اب درد تر فہم سے ہے میری کہانی

تجھ کو یہ سمجھ آئے گی اب میری کہانی
ہر لفظ نے تبدیل کئے اپنے معا[نی]

افکار سے انساں کو بقا بھی ہے فنا بھی
فانی ہیں جو افکار تمہارے تو بھی ہے فا[نی]

"تا حدِ نظر اب ہے اندھیرا ہی اندھیرا"
یہ ذوق ہے مٹتی ہوئی دنیا کی نشا[نی]

اے ارضِ جہاں کس کی ضرورت ہے تجھے آب
آنسو کا یہ پانی ہے تلوار کا پا[نی]

بہبودیٔ آدم کے اگر کام نہ آئی
کس کام کی اے ذوقِ سخن تیری جوا[نی]

اے شاعرِ امروز کہ انساں سے مخاطب
افلاک پہ اب فاش نہ کر رازِ نہا[نی]

جس نظم میں موجود نہ فردا کی تڑپ ہو
وہ نظم ہے آزاد فقط مرثیہ خوانی